Fikr-o-Nasar (Islamabad) 25:3 (1988)

موجودہ ہندوستان میں اقبـال ★

سید صباح الدین عبدالرحمن

ڈاکٹر اقبال ہم دار المصنفین شبلی اکیڈمی والوں کے دل و دماغ پر برابر چھائے رہے ۔ پہلے میں اپنا ایک ذاتی واقعہ سناؤں ، جب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم تھا تو ایک ایجوکیشنل ٹرپ وہاں سے دھلی اور امرت سر ہوتا ہوا لاہور پہنچا ، جہاں لوگ ڈاکٹر اقبال کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہوئے ، ہم میں سے کسی نے ان کو دیکھا نہیں تھا، میں ان کی بانگ درا ، اسرار خودی ، رموز بے خودی اور زبور عجم پڑھ چکا تھا ۔ ان کے فلسفہ خودی اور بے خودی سے کچھ آشنا ہو چلا تھا، مگر ان کی نظموں میں شکوہ ، جواب شکوہ ، خضر راہ ، طلوع اسلام اور فریاد تبسم سے بہت متأثر تھا ۔ ان کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتا تھا ۔ ساتھیوں نے ان سے وقت مانگا تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا نام سن کر ملنے کا وقت مقرر کر دیا ۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ میکلوڈ روڈ میں ان کی کوٹھی کی طرف چلا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آرزوؤں کی جنت میں داخل ہونے جا رہا ہوں ۔ ہم لوگ ان کے ڈرائینگ روم میں بٹھائے گئے جو زیادہ سامان سے آراستہ نہ تھا ۔ وہ بغل کے کمرے سے قمیض اور شلوار پہنے ڈرائینگ روم میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے، ملازم نے ان کا حقہ لا کر ان کے پاس رکھ دیا ۔ بجلی کی سرعت سے

★ یہ مقالہ مرحوم نے ادارہ تحقیقات اسلامی کے زیر اہتمام یوم اقبال منعقدہ ۹ ۔ نومبر ۱۹۷٦ء میں پیش فرمایا تھا ۔

میری نگاہ ان کی طرف اٹھی کہ مسلمانوں کو صداقت کا ، شجاعت کا، امامت کا سبق دینے والا ، نیل سے کاشغر تک مسلمانوں کو ایک کرنے والا، طلوع اسلام لکھ کر مسلمانوں کو حیات نو کا مژدہ سنانے والا ، اپنے رب سے دل مسلم میں زندہ تمنا مانگنے والا ، مسلمانوں کی روح کو تڑپانے اور ان کے قلب کو گرمانے والا، انسان کو خودی کا پیام دے کر ، اس کو اپنی ہستی کے اسرار اور زندگی کے سوز و ساز کا احساس دلانے والا اور پھر انفرادی زندگی کے جزء کو قومی زندگی کے کل میں شامل کرکے یکدلی اور یکجہتی کی بنیاد رکھنے والا، اور اپنی غزلوں کے ذریعے سے سرود زندگی میں حرارت آتش پیدا کرنے والا سامنے ہے۔ آنکھوں کو نور بخش رہا ہے۔ دماغ کو روشن کر رہا ہے۔ ذہن پر ایک ٹھنڈی چاندنی بکھیر رہا ہے۔ ساتھیوں سے فرداً فرداً خیریت پوچھی ، مسلم یونیورسٹی کا حال پوچھا ، میں نے بے تابانہ ان کی طرف اپنی آٹو گراف بک بڑھا دی۔ جس میں انھوں نے بڑے صاف اور پاکیزہ حروف میں تحریر فرمایا ۔

صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

یہ ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے ، گزشتہ ۴۳ سال سے ان کے کلام کو اسی شعر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، پھر اپنے استاد المکرم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صحبت اور ان کی تحریروں سے ڈاکٹر اقبال کی عظمت کا قائل ہوتا گیا ۔ جنھوں نے اپنی مثنوی اسرار خودی، رموز بیخودی، پیام مشرق ، بال جبریل اور ضرب کلیم بھیج کر ان سے ان کی رائے طلب کی ، حضرت سید صاحب نے معارف میں ان پر ریویو لکھ کر اپنا خراج عقیدت پیش کیا، مثلاً ان کی مثنوی رموز بیخودی پر ریویو کرتے ہوئے تحریر فرمایا ۔

,, یہ ناممکن ہے کہ جو مصرعہ ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے ، وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اتر جائے ، شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری کی راہ سے حملہ کرتے ہیں " ۔

آخر میں لکھتے ہیں :

,,ڈاکٹر اقبال نے جو اسرار و نکات اس میں حل کئے ہیں، ان کی بناء پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فن قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید علم کلام کی ایک بہترین کتاب ہے ، توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت ، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب، فیصلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پر اثر اور تشفی بخش دلائل اس کے اندر موجود ہیں (معارف اپریل ۱۹۱۸ء) ۔

ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کے ریویو کی قدر کی، ایک مکتوب میں ان کو تحریر فرمایا ۔

,, معارف میں ابھی آپ کا ریویو مثنوی رموز بیخودی پر نظر سے گذرا ہے ، جس کے لئے سراپا سپاس ہوں، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لئے سرمایہ افتخار ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے ۔ (اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۸۱) ۔

ایک اور موقع پر سید صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے بعض محاورات و تراکیب کے متعلق اپنے شکوک کا اظہار کیا، مثلاً ان کے نزدیک بحر تلخ رو (کلمہ بہ سکون لام) باریک تر از جو (بمعنی کم در عرض و عمق) کوری ذوق ، محفل از ساغر رنگین کردن، سرمہ او دیدہ مردم شکست، ساز برق آھنگ، از گل غربت (بمعنی شر) نوا بالیدن، صبح آفتاب اندر قفس ، سپر کردن وغیرہ جیسے محاورات اور تراکیب صحیح نہیں تھیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان کی سند ناصر علی ،

صائب، زلالی، ظہوری ملا طغرا اور بہار عجم سے پیش کر دی تو سید صاحب نے پھر ان کے عدم صحت پر اصرار نہیں کیا ۔ مگر اسرار خودی کے بعض قوافی کے متعلق سید صاحب کی تنقیدوں کو صحیح ماننے میں ڈاکٹر صاحب کو تأمل نہیں ہوا ، اس لئے ان کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ۔

,,قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے فرمایا ، بالکل بجا ہے ، مگر چونکہ شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی ، اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا، اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں تقریباً ہر صفحہ پر اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں ....تاہم آپ کے ارشادات نہایت مفید ہیں میں ان سے مستفید ہونے کی پوری کوشش کروں گا ۔ "
(اقبال نامہ ص ۸٦) ۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے جھکتے رہے اسی میں دونوں کی عظمت ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو جو خطوط لکھے ہیں وہ اقبال نامہ میں بہت لطف و لذت سے ہندوستان میں پڑھے جاتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب اپنے بلند مرتبہ اور عالمگیر شہرت کے باوجود جس خاکسارانہ انداز میں اپنی علمی و مذہبی مشکلات کو سید صاحب کے سامنے پیش کرتے رہے اس سے اس دانائے راز، پیامبر خودی ، محی الملت و الدین اور ناہید نفس شاعر کی عظمت دلوں کی گہرائیوں میں قائم ہوئے بغیر نہیں رہتی ، عالم اسلام کا یہ شاعر ، توقیر آدم کا یہ مبلغ، مشرق کو خواب گراں سے بیدار کرنے والا یہ مفکر جب سید صاحب کو علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد ، استاذ الکل ، اور صاحب کشف کہہ کر مخاطب کرتا ہے تو اس کی فراخدلی علم شناسی اور پاک طبیعتی کے جلوے اور بھی نمایاں ہو جاتے ہیں ، خود سید صاحب کو ڈاکٹر صاحب سے بڑا والہانہ لگاؤ رہا ، ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے حکمران نادر شاہ کی دعوت پر وہ ڈاکٹر صاحب اور

سرراس مسعود کے ساتھ وہاں گئے تو اپنے سفرنامہ سیر افغانستان میں ڈاکٹر صاحب کا ذکر انتہائی محبت، عقیدت اور اخلاص سے کیا ہے۔ واپسی پر ایک روز اپنی نجی صحبت میں فرمایا کہ اس سفر میں ایک موقع پر انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جب تک ہندوستان میں ان کی شاعری باقی ہے ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ اس کی بجائے یہ کہنا درست ہوگا کہ مولانا شبلی اور دار المصنفین کی مطبوعات جب تک ہندوستان میں باقی ہیں، ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا سرراس مسعود نے اس گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کیا کہ پھر اس طرح کیوں نہ کہا جائے کہ جب تک ڈاکٹر اقبال کی شاعری اوز مولانا شبلی اور دار المصنفین کی مطبوعات ہندوستان میں باقی ہیں یہاں اسلام باقی رہے گا ۔ یہ سن کر دونوں ہنس پڑے ۔ سید صاحب ہم لوگوں سے برابر فرمایا کرتے کہ اسلام میں ڈاکٹر اقبال کے اتنا بڑا مفکر عرصہ دراز کے بعد پیدا ہوا ہے، جب ان کی وفات کی خبر سنی تو انتہائی اضطراب میں دیر تک ٹہلتے رہے، معارف کے شذرات میں ان کی وفات پر جو اظہار غم کیا ہے وہ ان کی ادبی تحریروں کے شاہکاروں میں ہے، وہ رقمطراز ہوئے ۔

,, ایسا عارف فلسفی ، عاشق رسول شاعر ، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا ، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا ، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم ، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق ، اس کے شعر کی ہر پرواز بال جبریل تھا، اس کی فانی عمر ختم ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ رہے گا،، (مئی ۱۹۳۸ء معارف)

دار المصنفین کی مطبوعات میں ایک کتاب اقبال کامل ہے، اس کی اشاعت پر اس کو فخر ہے ، ہندوستان کے مشہور ادیب جناب

پروفیسر رشید احمد صدیقی مجھ سے برابر کہتے رہتے ھیں کہ یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر اقبال اسی کتاب کے ذریعے سے سمجھے گئے ۔ کیونکہ اس کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے ڈاکٹر اقبال کے فلسفیانہ رموز اور شاعرانہ نکات کو جس آسان، سلیس اور دل نشین انداز میں سمجھایا ہے ، کوئی اور نہ سمجھا سکا ہے ۔ معارف میں اقبالیات پر برابر مضامین نکلتے رہتے ھیں ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ فلسفہ کے استاد ڈاکٹر عشرت انور زبیری نے معارف کی کئی اشاعتوں میں ڈاکٹر اقبال اور یورپی فلسفیوں کے خیالات کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے ، جو بہت شوق سے پڑھا گیا ۔ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی نے ,, کیا اقبال فرقہ پرست تھے " کے عنوان سے ایک کتاب میں مفصل اور پر مغز مضمون معارف میں لکھا ، جس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ھوئیں ۔ انھوں نے ندوۃ العلماء لکھنو میں ڈاکٹر اقبال پر ایک توسیعی لیکچر دیا، جس میں ان کی عظمت کے جلوہ صدرنگ کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے ، یہ بھی معارف میں چھپا۔

اس خاکسار نے ڈاکٹر اقبال اور علامہ سید سلیمان ندوی کے تعلقات کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا جو جناب شورش کشمیری مرحوم کے ھفتہ وار اخبار ,, چٹان " کے اقبال نمبر میں چھپا ۔ پھر یہ معارف میں بھی شائع کیا گیا ۔ پٹنہ کے ایک بیرسٹر ڈاکٹر سچانند سنہا نے انگریزی میں ,, **اقبال ھز ٹائمس اینڈ ورکس** " کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں انھوں نے صحافتی انداز میں ڈاکٹر اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بہت ھی فروتر دکھانے کی کوشش کی ۔ اس کو پڑھ کر میں نے انگریزی میں ایک طویل تبصرہ لکھا ، جس میں بیرسٹر صاحب کی عدم رواداری اور شعر و ادب کی ناقدر شناسی کی پردہ کشائی کی ، یہ تحریر لاھور کے انگریزی رسالہ اسلامک لٹریچر میں شائع ھوئی ۔ جولائی ۱۹۷۵ء کے معارف میں

ہندوستان کے مشہور شاعر جناب جگن ناتھ آزاد کا ایک بہت اچھا مضمون ,, اقبال کے کلام میں عورت کی حیثیت ،، کے عنوان سے شائع ہوئی ، پھر ۱۹۷٦ء میں ان ہی کا ایک بہت پر مغز اور مفید مقالہ ,,اقبال اور اشتراکیت،، کی سرخی کے ساتھ معارف کی کئی اشاعتوں میں چھپا ۔

ڈاکٹر اقبال نے جو خطوط سید صاحب کو لکھے تھے ان کو ایک بہت ہی عمدہ جلد میں بندھوا کر دار المصنفین کی اور بیش بہا علمی دولت کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہے ۔ ایک پاکستانی دوست نے اس مجموعہ کو کراچی میوزیم کیلئے یہ کہہ کر طلب کیا کہ دار المصنفین اس کے بدلے جو بھی قیمت طلب کرے گا نذر کی جائے گی، میں نے اس پیش کش کا جواب یہ کہہ کر دیا کہ اگر ڈاکٹر اقبال آپ کے لئے شوکت، رفعت اور عظمت کے باعث ہیں تو وہ ہماری علمی، ادبی اور مذہبی وراثت کے بھی عزت اور آبرو ہیں ۔ ہمارے پاس بھی کچھ ایسی چیزیں رہنے دیجیئے، جن سے ہماری بھی علمی آبرو اور عزت بڑھے ۔

ہندوستان میں اس وقت ڈاکٹر یوسف حسین کی ,, روح اقبال ،، بہت مقبول ہے ، وہ اقبال کے بہت بڑے پرستار ہیں، ان کے متعلق لکھتے ہیں ۔

,,اقبال کے جسم خاکی میں ایک مصلح حیات کی عرفان جو، صداقت پسند اور نظم آفریں روح تھی جو جذبہ دینی کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضبط و نظم قائم کرنا چاہتی تھی ، وہ شاعر بھی تھا اور حکیم نکتہ داں بھی، اس کے ہاں درد رموز بھی ہے اور رندی و مستی بھی ، نصیحتیں بھی ہیں اور دین و تمدن کی تعلیم بھی ، عقل و مستی کی ابدی کشمکش کا بیاں بھی ، حسن کی کرشمہ سازیوں کی تعاشی بھی، اقبال کی نظر حقیقت اور مجاز

دونوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ کبھی وہ والہانہ انداز میں انسانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور کبھی اپنے افکار عالیہ سے تقدیر کے سر بستہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے ، وہ کبھی زندگی کے قافلے کو طوفان و ہیجان سے ضبط و نظم کی طرف بڑھائے لئے جاتا ہے اور کبھی اپنے علم پرور حکیمانہ مشوروں سے ضبط و نظم کی تعلیم دیتا ہے ، غرض کہ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں کا کوئی راز اس کی بصیرت سے پوشیدہ نہیں ۔ اس کی زندگی میں مشرق و مغرب کے علم و حکمت کے دھارے آ کر مل گئے تھے ، جتنا زمانہ گزرے گا ، اتنا ہی اس کے کلام کی تاثیر بڑھتی جائے گی ۔ ادب اس کی خدمت کی قدر کرے گا، فلسفہ اس کے تخیل و وجدان سے بصیرت افروز ہوگا ، سخن آرائی اس کی نازک خیالی پر وجد کرے گی ۔ اس نے اپنے پیغام کے طلسم سے پوری قوم کی رگوں میں زندگی کی لہر پیدا کر دی ہے ،، (روح اقبال ص ۱۵ ۔ ۱۳) ۔

ڈاکٹر یوسف حسین کی اس کتاب کی بدولت ڈاکٹر اقبال کی شاعرانہ عظمت خوب سمجھی جا رہی ہے ۔ خواجہ غلام السعدین مرحوم کی Iqbal's Educational Philosophy کے ذریعے ان کے نظریہ تعلیم کے سمجھنے میں آسانی ہو رہی ہے ۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی ، ناظم ندوۃ العلماء لکھنو نے عربی میں ,, روائع اقبال ،، لکھی ہے جس کا اردو میں نقوش اقبال اور انگریزی میں Glory of Iqbal کے نام سے ترجمہ ہوا، اس کے فاضل مصنف نے اقبال کے پیامات، افکار اور تصورات کے لافانی نغموں اور ان کی دعوت فکر و عمل کو عربی زبان میں منتقل کرکے ان کے اس ایمان و یقین کو بلاد عربیہ تک پہنچایا ہے کہ مغربی تہذیب اپنا رول ادا کرچکی ، اس کا وقت پورا اور اس کا ترکش خالی ہو چکا ہے ، یہ پکے ہوئے پھل کی طرح ٹوٹ کر گرنے والا ہے ، آئیندہ اس دنیا کی تعمیر وہی کر سکتا ہے جس نے

انسانیت کے لئے دنیا میں بیت الحرام بنایا تھا اور ابراھیم و محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے وارث ہوئے تھے اور دنیا کی قیادت کا علم سنبھالا تھا، اب پھر وقت آ گیا ہے کہ بانی بیت الحرام اور حامل پیام اسلام عالمی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور مغرب کے پیدا کردہ فساد کو اصلاح ، بگاڑ کو بناؤ اور تخریب کو تعمیر سے بدل دے اور قواعد ابراھیمی اور سنت محمدی کے نقشہ کے مطابق دنیا کی تعمیر نو کرے (نقوش اقبال ص ۱۵۸ ـ ۱۵۷)

ھندوستان میں اس وقت ڈاکٹر اقبال کے پرستاروں میں سب سے نمایاں حصہ جناب جگن ناتھ آزاد کا ہے ، وہ اردو کے مشہور شاعر تلوک چند مرحوم کے لائق فرزند ھیں، خود بھی بہت ھی اچھے اور مقبول شاعر ھیں ـ ان کو ڈاکٹر اقبال کی ھر چیز سے عشق ہے ، انھوں نے ان کی تحریروں، کتابوں اور خطبوں کی ایک نمائش مرتب کر رکھی ہے ، جس کو مختلف شہروں میں دکھا کر لطف و لذت حاصل کرتے ھیں ، وہ اسی محبت میں اسپین گئے جہاں جا کر قرطبہ دیکھا ، اس پر ڈاکٹر اقبال کی نظم بہت مشہور ہے وہ جگہ بھی ڈھونڈھ نکالی جہاں بیٹھ کر انھوں نے دعا مانگی تھی، وہ میونخ بھی گئے جہاں ڈاکٹر صاحب نے تعلیم پائی تھی، انھوں نے بڑی فراخدلی سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مذھبی اور اسلامی شاعر تھے جو ان کا کوئی نقص نہیں ـ آخر ویاس نے "مہا بھارت" والمیکی نے "رامائین ملٹن نے " پیراڈایز لاسٹ " اور دانتے نے " ڈیوائن کامیڈی " لکھ کر اپنے کو دنیا کے عظیم ترین شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے ، تو پھر اسی صف میں ڈاکٹر اقبال کو کیوں نہ جگہ دی جائے ـ ۱۹۴۷ء کے بعد ڈاکٹر اقبال ھندوستان کے تعلیمی اداروں سے نکال دیئے گئے تھے ـ میرا اپنا خیال ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی جرأت مندانہ تحریروں کی بدولت پھر وھاں کے تعلیمی اداروں میں واپس بلائے گئے ھیں ـ جہاں

ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے ، بعض یونیورسٹیوں میں ان پر توسیعی لیکچر بھی دیئے گئے ہیں، ان کا صد سالہ جشن بھی ہماری مرکزی حکومت کی طرف سے منایا جانے والا ہے ۔ اس کے لئے کئی کمیٹیاں بھی بن گئی ہیں ۔ ان کی نیشنلزم بھی زیر بحث ہے اس سلسلہ میں جگن ناتھ آزاد نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ان کی وطنی نظموں میں اسلام کا ہمہ گیر نظریہ موجود ہے اور ان کے اسلام کے ہمہ گیر نظریوں میں وطنیت پائی جاتی ہے ۔ جگن ناتھ آزاد ہی کے قلم سے یہ نکتہ وری زیادہ مؤثر ہو سکتی ہے ۔

ڈاکٹر اقبال نے خضر راہ ، پیام مشرق اور زبور عجم میں مزدوروں کی جو حمایت کی ہے یا جاوید نامہ میں اشتراکیت پر جو بحث کی ہے یا لینن خدا کے حضور میں اور فرمان خدا وغیرہ کے عنوانات سے جو نظمیں کہی ہیں ان کو سامنے رکھ کر بعض اہل قلم اپنی ذہانت کی تیزی اور طراری سے ان کو سوشلسٹ بھی ثابت کر رہے ہیں، مگر جگن ناتھ آزاد نے ان ہی کی تحریروں سے اس کی پوری تردید کر دی ہے ، انہوں نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر نقل کی ہے ۔

,,اسلام ہیئت اجتماعیہ انصافیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا ۔ وہ ہیئت اجتماعیہ انصافیہ کے کسی اور ذہن سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے ،، (مضامین اقبال ص ۱۸۲، معارف فروری ۱۹۷۶ء ص ۸۹) ۔

ڈاکٹر اقبال نے تو مسولینی پر بھی ایک نظم کہی ہے ، پھر تو ان کو فاشزم کا بھی حامی کہا جا سکتا ہے وہ ایک عظیم مفکر ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے ، کبھی کبھی حالات سے متأثر ہو کر شاعرانہ

انداز میں ایسی نظمیں بھی کہہ جاتے تھے ، ورنہ اگر ان کے پورے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو سیدھے سادے الفاظ میں یہ کہنے میں شرمانا نہ چاہیئے کہ وہ خالصتاً ایک اسلامی مفکر تھے جو یہ پیام دے کہ :

گر تومی خواهی مسلمان زیستن نیست ممکن جزبه قرآن زیستن

وہ مسلمان شاعر کے سوا کیا اور کچھ ہو سکتا ہے وہ قرآن حکیم کی تعلیمات سے متأثر ہو کر مسلمانوں میں صبغة اللهی رنگ دیکھنا چاہتے ہیں یعنی اگر ان میں عشق الهی نہیں تو وہ کافر ہیں ۔

قلب را از صبغة الله رنگ ده عشق را ناموس و ننگ ده

طبع مسلم از محبت قاهر است مسلم از عاشق نباشد کافر است

ان کے نزدیک مسلمانوں کا آئین وہ زندہ کتاب ہے جو قرآن حکیم کہلاتا ہے اسی کی بدولت ان کا پیکر زندہ رہ سکتا ہے ۔

توهمی دانی که آئین تو چیست؟ زیر گردوں سیر تمکین تو چیست

آں کتاب زنده قرآن حکیم حکمت اولا یزال است و قدیم

از یک آئینی مسلمان زنده است پیکر ملت ز قرآں زنده است

قرآن حکیم ہی کے مطالعہ سے وہ اپنی شاعری میں انسانیت کو بلند رتبہ دے گئے ہیں، ان کے نزدیک انسان خدا کی برگزیدہ مخلوق ہے وہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود زمین پر خدا کا نائب بن سکتا ہے وہ آزاد شخصیت کا امین ہے انہوں نے قرآن حکیم ہی کے ذریعے سے اپنی شاعری میں گم شدہ انسان کی تلاش کی ہے۔ اور اس کو خودی کی دولت سے مالا مال کرکے صاحب لولاک بنانا چاہا ہے ، وہ تو انسان کو کائنات کی روح بن کر اس پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں ، ان کے یہاں انسان کامل ، مرد مومن اور مسلمان میں کوئی فرق نہیں ۔ مسلمان ایک انسان کامل بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے میں ایمان کی قوت، یقین کی ناقابل تسخیر طاقت ، قہاری، غفاری،

قدوسی، جبروت، شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی پیدا کرے ۔

ہندوستان میں اقبال کے فکر و فن ، فلسفہ خودی، رموز بے خودی فنون لطیفہ اور نظریہ تعلیم پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے ، ہندوستان کی عظمت پر ان کے جتنے اشعار ہیں وہ بھی جمع کرکے پیش کئے جا رہے ہیں ۔ ان کا ترانہ ہندی بھی گایا جاتا ہے ۔ نیا شوالہ ، ہمالہ رام، نانک، سوامی رام، تیرتھ وغیرہ پر ان کی جو نظمیں ہیں ان کا ذکر کرکے ان کی رواداری ، حب الوطنی اور فراخدلی بھی ثابت کی جا رہی ہے ان کی غزلیں اور نظمیں جہاں بھی پڑھی جاتی ہیں، سننے والے اعتراف کرتے ہیں کہ ان سے ان کے لطیف جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا ہے اور ان کے احساسات و کیفیات میں لہریں امنڈنے لگتی ہیں۔

جہاں ان کی شاعرانہ عظمت میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے وہاں ان کے فکر و فن سے متعلق کچھ اختلاف بھی ہے ۔ مثلاً ہندوستان کے بعض علمی حلقوں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال یورپی اور غیر اسلامی فلسفوں میں سے برگساں، نطشے ، کانٹ، شوپنہار، جیمس وارڈ اور ولیم جیمس وغیرہ سے متأثر ہوئے ۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ انہوں نے ان فلسفیوں کا مطالعہ ضرور کیا ہے لیکن قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کے خیالات کا اصلی سرچشمہ رہا ۔ ان کے نزدیک مولانا جلال الدین رومی بھی صحیح معنوں میں قرآن و سنت کے پابند رہ کر اپنے افکار کا اظہار کرتے رہے ۔ اس لئے انہوں نے ان کو اپنا مرشد معنوی بنایا، اور ان ہی کے مرید بن کر اپنے سارے خیالات کا اظہار کرتے رہے ۔ اس طرح وہ صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ ، حضرت علیؓ ، حضرت ابوذرؓ، حضرت سلمانؓ، اور حضرت بلالؓ سے متأثر ہیں ۔

حکماء میں بو علی سینا، ابن مسکویہ، ابن خلدون، امام غزالی، حکیم سنائی، شیخ فرید الدین عطار اور فارابی ان کے خیالات پر اثر انداز ہوئے ۔ بزرگان دین میں حضرت فضیل بن عباسؒ ، حضرت با یزید بسطامیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت ابو سعید ابو الخیر، حضرت اویس قرنی، اور حضرت سید احمد رفاعی سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ہندوستان کے صوفیۂ کرام میں حضرت ابوالحسن علی ہجویریؒ ، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات ان کے سامنے رہیں ۔ شاعروں میں حضرت شمس تبریز اور مولانا جلال الدین رومی کے علاوہ فخر الدین عراقی ، امیر خسرو ، جامی ، بیدل غنی کشمیری ، غالب، گرامی اور داغ سے کسب فیض کیا ۔ صحابہ کرام، اسلام کے حکماء، صلحاء صوفیہ اور شعراء نے قرآن اور سنت کی روشنی میں جو کچھ سوچا اور پیش کیا ان کو انھوں نے اپنی شاعری میں فلسفیانہ انداز میں مربوط منظم اور مرتب طریقہ سے پیش کر دیا ہے۔ جن کو پڑھ کر قلب میں یہ سوز ، روح میں یہ تڑپ، خیال میں یہ پختگی اور طبیعت میں یہ برق وشی پیدا ہوتی ہے کہ پیغام محمدی ھی میں رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی میں ان کی شاعری کی عظمت اور ان کا انفرادی رنگ ہے جو بقول رشید احمد صدیقی اس صدی کا علم کلام بن گیا ہے۔ جو ایک نامعلوم اور طویل مدت تک تازہ رہے گا ، اس لئے کہ ایسی صحتمند اور بامقصد بیداری کا امتیاز شاید ھی کسی اور عہد کے علم کلام کے حصہ میں آیا ہو ۔ (مقدمہ نقوش اقبال ص ۲۱) ۔

ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کے عارفانہ اور مذہبی خیالات کے سلسلہ میں یہ بحث بھی اٹھی کھڑی ہوئی ہے کہ وہ تصوف اور وحدت الوجود کے حامی یا منکر تھے ۔ شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ نے

صوفیوں کی تین قسمیں بتائی ہیں ۔ صاحب وصول ، صاحب اصول اور صاحب فضول، یہ آخری قسم سے مراد پیشہ ور مدعیان طریقت یعنی تصوف کی دکان لگانے والے ہیں ۔ ایسے صوفیوں کے مخالف اقبال ضرور تھے اور وہ کیا ہر مسلمان کو ہونا چاہیئے ۔ مگر وہ ان صوفیۂ کرام کے ضرور معتقد رہے جن کے حلقہ میں فسانہ ہائے کرامات کی بجائے سوز مشتاقی اور جن کی خانقاہوں میں روباہی کی بجائے شیری و شاہنشی کا مدرسہ رہا مگر ان کو دکھ تھا کہ یہ چیزیں اب مفقود ہیں ۔

رہا نہ حلقہ صوفی میں سوز مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

تھا جہاں مدرسہ شیری و شاہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی
قُم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گور کن

ان کے کلام میں بہت سے اکابر صوفیہ کا ذکر آتا ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ ان کی زندگی اور تعلیمات سے متأثر رہے ۔ میری ذاتی رائے ہے کہ وہ اس وحدت الوجود کے تو منکر تھے جو افلاطون کے یہاں ہے ، یا جو ویدانت فلسفہ کے ذریعے پھیلایا جس کی ترویج عیسائی راہبوں نے کی، یا جو کبیر، رامانج، میرا بائی، دادو، اکبر اور دارا شکوہ نے پیش کیا یا جس کے حامی ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت، نیکی و بدی، ثواب و عذاب کی تفریق مٹا کر مذہب و اخلاق سے بیگانگی پیدا کرتے ہیں یا جو وحدت الوجود کے حامی بن کر اسلامی توحید سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ۔ یا جو خدا کے سوا کسی اور چیز کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے یا جو جبر کا قائل نہیں، اس کو وہ کافر

سمجھتے ھیں لیکن ھندوستان کے اندر حضرت شرف الدین یحیی منیری ، شیخ اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ عبدالقدوس گنگوھی اور شاہ ولی اللہ جیسے بزرگان دین وحدت الوجود کے قائل رھے ۔ خود حضرت مجدد الف ثانی کا فلسفہ وحدت الشھود ، وحدت الوجود ھی کی ترقی یافتہ شکل ہے ، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری فرمایا کرتے تھے کہ شریعت کے بغیر راہ طریقت ، میں غرور ، جہل اور حمق پیدا ھو جاتا ہے ۔ جس کے بعد شیطان ورغلا کر ایمان برباد کر دیتا ہے

شیخ اشرف جہانگیر سمنانی کا عقیدہ تھا کہ اولیاء اللہ فنافی اللہ کے درجہ کو پہنچ نہیں سکتے جب تک کہ وہ ظاھراً و باطناً، قولاً ، فعلاً اور حالاً حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع نہ ھوں ۔ شیخ عبد القدوس گنگوھی کا قول ہے کہ جو وحدت الوجود کے ساتھ کفر و اسلام ، امر و نواھی ، ثواب و عذاب ، رحم و قہر میں تفریق نہیں کرتے اور نبوت کے منکرین ھیں وہ سؤفسطائیہ ھیں جو خارج از اسلام ھیں ۔ ڈاکٹر اقبال سؤفسطائیوں کے وحدت الوجود کے ضرور منکر رھے لیکن اگر وحدت الوجود سے مراد شریعت کی پابندی کے ساتھ عشق الٰہی کی سرشاری اور وارفتگی ہے تو ڈاکٹر اقبال یقینی طور پر وحدت الوجودی تھے، ان کے تصور عشق کی تکمیل اس کے بغیر ممکن نہیں ۔ بانگ درا میں ان کے یہ اشعار بھی ھیں ۔

کثرت میں ھو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ھنگاموں کا محل ھو
ھر شئے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ھو
نفی ھستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقین ہے مجھکو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

وحدت الوجود کے حامی ان اشعار کو پڑھ کر جھوم سکتے ھیں مگر ڈاکٹر اقبال کے ایک مقرب خاص جناب خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا کہ انھوں نے یہ اشعار مظاھر فطرت کی اساسی وحدت کو بیان کرنے کے لئے کہے تھے (فکر اقبال ص ۳۱۰) یہ بیان اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو پھر بال جبریل میں جو یہ پکار اٹھے ھیں ۔

ع ۔ ھر ذرہ شہید کبریائی

اور یہ بھی کہ

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں باقـی ہے نمود سیمیائی

تو اس کے متعلق کیا تاویل ھو سکتی ہے ؟ پھر ضرب کلیم میں ان کے دل کی گہرائیوں سے یہ صدا اٹھی ۔

خرد ھوئی ہے زمان و مکان کی زناری نہ ہے زمان نہ مکان لا الہ الا اللہ

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور اشھد ان لا الہ اشھد ان لا الہ

ارمغان حجاز میں کہتے ھیں :

تو اے نادان دل آگاہ دریاب بخود مثل نیا گان راہ دریاب

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش لا موجود الا اللہ دریاب

اگر یہ کہا جائے کہ صحیح ھوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ جتنا وسیع ھوتا گیا وہ وحدت الوجود کو قرآن اور حدیث کے مطابق تصور کرنے لگے ، اس مسئلہ پر بحث کرتے ھوئے یہ بھی ملحوظ رکھنا چاھیئے کہ وہ زمز آشنائے روم و تبریز رھے ، وہ پیر روم کو اپنا مرشد قرار دیتے ھیں ۔ ان ھی سے مرگ و زندگی کا راز سیکھا، ان ھی سے ان کو مقام کبریائی کا سرور ملا، ان ھی سے انھوں نے سربستہ اسرار کے دفتر سے سارے علوم سیکھے، ان ھی کی بدولت ان کی خاک اکسیر بن گئی، ان کی نگاہ روشن ھوئی اور ان کے سبو میں جیحون منتقل ھو گیا ۔

زچشم مست رومی وام کردم سروری از مقام کبریائی
باز برخوانم زفیض پیر روم دفتر سر بسته اسرار علوم
پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوه ها تعمیر کرد
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحون

مولانا روم کے یہاں جہاں ایمان، ایقان، عرفان، وجود باری، پشت انبیاء ، معاد ، جبرو اختیار ، عشق و عقل، زھد و قناعت وغیرہ کی تعلیمات ھیں وھاں وہ اپنی مثنوی میں وحدت الوجود کے مسلک کی بھی ترویج کرتے گئے ھیں ، ان کے یہ اشعار تو بہت مشہور ھیں ۔

آنہا کہ طلبگار خدائید خدائید
پیروں زشما نیست شمائید شمائید
چیزے کہ نگردید گم از بہرچہ جوئید
کس غیر شما نیست کجائید کجائید

ڈاکٹر اقبال نے اپنے مرشد معنوی کے افکار و تصورات کو جس خوبی سے اپنایا ہے ، ان کے وحدت الوجود کو نہ اپناتے تو وہ اپنے کو ذھنی حیثیت سے مطمئن نہ پاتے، وہ جو یہ کہہ گئے ھیں ۔

عشق دم جبریل، عشق دل مصطفٰے
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
عشق مکان و مکین، عشق زمان و زمیں

آخر یہ نعرے اور نغمے کیا اور کیسے ھیں ؟ ان کے عشق سے متعلق جتنے بھی فلسفیانہ رموز و نکات بیان کئے جائیں ۔ آخر میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا ، ان کا عشق خدا ہے اور ان کا خدا عشق ہے ، ان کے نزدیک انسان کی معراج یہ ہے کہ وہ عشق الہی میں سرشار اور مست ھو کر اسی کو مصدر حیات اور مقصود حیات بنائے، تاکہ وہ حیات لامنتاھی کا مالک بن جائے ۔

عشق الہی میں یہ سرشاری اور مستی اگر ابن عربی کا وحدت الوجود نہیں تو اقبال کا اپنا وحدت الوجود ضرور ہے جس پر نہ صرف اس دور کی فلسفیانہ اور عارفانہ شاعری کو ناز ہے بلکہ انسان اور مسلمان دونوں کو کامل بنانے کے لئے روح پرور پیغام ہے ۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا کلام جب اچھی طرح سمجھ لیا جائے گا تو ان کے وحدت الوجود کی قدر زیادہ سے زیادہ بڑھ جائے گی ۔ جس کو فطرت کی اساس وحدت یا فطرت کی وحدت وجود یا توانا، تندرست اور متحرک وحدت الوجود ، یا اقبال کے طرز فکر کا وحدت الوجود جدید جو بھی چاھیں کہہ لیں ۔

ان کے وحدت الوجود میں شیخ شرف الدین یحیی منیریؒ اور شیخ اشرف جہانگیریؒ کی طرح عشق رسولؐ کے بھی نعرے ھیں، سرشارانہ اور والہانہ انداز میں نغمہ زن ھوتے ھیں ۔

از رسالت در جہاں تکوین ما از رسالت دین ما آئین ما
دین فطرت از نبی آموختیم در رہ حق مشعلے افروختیم
قوم را سرمایۂ قوت ازو حفظ سر وحدت ملت ازو
در دل مسلم مقام مصطفے است آبروئے ما زنام مصطفے است

ان کے یہاں عشق الہی اور عشق رسولؐ دونوں لازم و ملزوم ھیں،

اس لئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ بحر و بر اور برگ و ساز کائنات پر حکمرانی عشق مصطفیٰ ہی کر ذریعے ہو سکتی ہے۔

ہر کہ عشق مصطفیٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشہ دامان اوست
زانکہ ملت را حیات از عشق اوست
برگ و ساز کائنات از عشق اوست

ان مباحث سے ہٹ کر اس موقع پر یہ بھی عرض کرنا ہے کہ روائع اقبال کے مصنف مولانا ابو الحسن علی ندوی پاکستان کے وجود میں آنے سے دس سال پہلے ڈاکٹر اقبال سے ایک بار ملے تو ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا تھا کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی ، وہ اپنے مذہب و تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی ۔ دین و تہذیب ، حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں ، اسی لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے (نقوش اقبال از مولانا ابو الحسن علی ندوی ص ۳۵) ، مولانا ابو الحسن علی ندوی ابھی بقید حیات ہیں ، ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو ہیں ۔ اسلامی ممالک کے ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتے ہیں ، وہ اپنے ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ پاکستان کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ یہاں کے لوگ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو کس سمت لے جا رہے ہیں ۔ ان کا قبلہ و کعبہ کون سا بن رہا ہے۔ ان کے عاشق رسول شاعر نے ان کو جو یہ پیغام دیا تھا کہ :

تا شعار مصطفیٰ از دست رفت قوم را رمز بقا از دست رفت

یا ان کا جو یہ نعرہ تھا کہ :

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو فارغ از ارباب دون اللہ شو
شکوہ سنج سختی آئین مشو از حدود مصطفیٰ بیرون مرو
ع ۔ مشو نومید و راہ مصطفیٰ گیر

وہ آخر وقت تک یہ کہتے رہے :

مقام خویش اگر خواهی درین دیر   به حق دل بند و راہ مصطفیٰ رو

کیا یہاں کے خواص و عوام ان پیامات پر عمل کر رہے ھیں یا یہ محض شاعرانہ باتیں تصور کی جا رھی ھیں یا ان کو یوٹوپیا سمجھا جا رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا سمجھ لیا گیا ہے تو اس کے یہ معنی ھیں کہ یہاں کے لوگ اغیار کی نظر و فکر کے مال خانہ ھی میں گروی رہ کر مطمئن اور جھوٹے نگون کی صناعی اور مینا کاری ھی سے خوش رھنا چاھتے ھیں مگر ان ھی کے مفکر اعظم نے یہ کہہ کر ان کی تنبیہہ کی ہے۔

ع ۔ تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ جب یہ خاکسار ھوائی جہاز سے اسلام آباد آ رہا تھا تو اس پر اخبار جنگ کا اقبال نمبر ملا ، جس میں ھندوستان کے دو دانشوروں کی رائیں ایک مضمون میں پڑھیں ۔ ایک تو ھندوستان کے مشہور شاعر فراق گورکھپوری کی تھی، جنھوں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ آزادی کے بعد اقبال کی شاعری اور ان کی شاعرانہ عظمت و مقبولیت میں بہت کمی آ جائے گی کیونکہ ان کی شاعری کی بنیادیں ایک مخصوص مذھب کے جذبات، احساسات اور عقائد پر قائم ھیں، جن سے احیائی رجحان کا اندازہ ھوتا ہے۔ دوسری رائے ھندوستان کے ممتاز مورخ ڈاکٹر تارا چند کی تھی ، ان کا خیال تھا کہ فکر و حساس کے اعتبار سے ڈاکٹر اقبال بہت ھی عظیم شاعر ھیں، ان کی شہرت اور مقبولیت میں کمی کا سوال ھی نہیں اٹھتا ۔

حضرات ! اب آپ کا یہ امتحان ہے کہ ان دونوں پیشین گوئیوں میں کس کو صحیح ھونے کا موقع دیتے ھیں ۔ شکریہ ۔